R. No. 2186/57

Regd. No. L 922.

انجمن ترقی اُردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
[illegible]

ٹیلی فون ۔ ۲۹
قیمت فی پرچہ ۱۰
[illegible]

جلد ۲۵ ۔ شمارہ ۲۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ رجون ۶۶ ۱۹ء

آل احمد سرور

نظم کی زبان

زبان کا تصور سماج کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ فرد کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی، وہ سماج سے ایک زبان سیکھتا ہے۔ تحریر کی اہمیت کے باوجود زبان کی بنیاد بول چال میں ہے۔ زبان سیکھ لی جائے تو یہ ایک عادت بن جاتی ہے۔ زبان میں طبقوں کا فرق بھی ملتا ہے۔ اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بقول ماریو پائی کے جس زبان میں تبدیلی نہیں ہوتی، وہ مردہ ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اصوات میں بھی ہوتی ہے، الفاظ میں بھی، قواعد میں بھی اور معنی کے رشتوں میں بھی۔ زبان میں جہاں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، وہیں وہ ایک معیار بھی حاصل کرنے اور پھر اسے قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ادبی اسالیب، ایک مضبوط مرکزی حکومت، نصاب تعلیم کی یکسانیت، تجارت ونقل وحرکت کے ذرائع، فوجی خدمت اور ایک ترقی یافتہ دفتری نظام، ایک مذہب یا ایک قومیت کے تصور سے بھی معیار میں مدد ملتی ہے۔ اگر معیار قائم رکھنے کی قوت کم ہو جائے، تو تبدیلی کی صلاحیت اپنا اثر زیادہ دکھائے۔ تحریر کی زبان میں عام طور پر تبدیلی بول چال کی زبان میں تبدیلی کے پیچھے چلتی ہے۔ اچھی زبان وہ ہے، جو پوری تہذیب کی آئینہ دار ہو۔

ہم زبان کے اس تصور کو ذہن میں رکھیں، تو ادبی زبان کو اتنا مقدس نہیں سمجھا جا سکے گا، نہ اس کی بعض خوبیوں کی خاطر بول چال کی زبان سے اس کی بہت زیادہ دوری گوارا کی جا سکے گی۔

ظاہر ہے کہ ادبی زبان معیاری زبان ہے، یہ الفاظ کی بہترین ترتیب کا دوسرا نام ہے۔ یہاں الفاظ سائنسی زبان کی طرح صرف معلومات کی کنجی نہیں، نہ بول چال کی زبان کی طرح محض کام چلاؤ۔ یہاں الفاظ کا اظہار تخلیقی ہے۔ یہ بھرپور تاثر دیتے ہیں، یہ ذہن کے دریچے کھولتے ہیں، فضا میں بے نام پل بناتے ہیں، اور زمان ومکان کو اسیر کر لیتے ہیں۔ اگر رفتہ رفتہ ان میں وہی بات آ جاتی ہے، جو اُن صاف شدہ چاولوں میں ہوتی ہے، جن کا حیات بخش جوہر کھینچ لیا گیا ہو۔ اگر ادبی زبان بول چال کی زبان سے دور ہو جاتی ہے، تو وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ دکھائی دے، اس کی مثال ان کاغذی پھولوں کی سی ہے، جو آنکھوں کو تو بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر خوشبو نہیں دیتے، نہ ان کے گرد شہد کی مکھیاں بھنبھناتی ہیں۔ شاعری کی زبان نثر سے مختلف ہوتی ہے۔ شاعری تخلیقی اظہار ہے، نثر تعمیری۔ شاعری کی زبان تاثر عطا کرتی ہے، نثر کی علم۔ ایک متاثر کرتی ہے، دوسری قائل۔ بہرحال دونوں معیاری زبان کے دو پہلو ہیں، جو ایک دوسرے کو مدد دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔

ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلی شاعر کی وہ آواز ہے، جب وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ دوسری جب وہ ایک مجمعے کو خطاب کرتا ہے۔ اور تیسری جب وہ کسی فرضی یا اصلی کردار کی زبان میں بولتا ہے۔ شاعر جب اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے، تو اگرچہ اس وقت بھی وہ یہی سماجی آلہ استعمال کرتا ہے، مگر ایک طرح سے اس وقت وہ دنیا سے کچھ بے تعلق سا ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک غزل کی زبان اسی پہلی آواز کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہماری غزل چونکہ صرف دل کی واردات نہیں رہی، اسی لیے اس کی زبان بھی صرف شاعر کی

اس شمارے میں

غزل کو ہی تنگ محدود نہیں رہی، بلکہ اس میں دوسری دونوں آوازوں کی لے بھی شامل ہو گئی ہے۔ یہ اچھا ہی ہوا، مگر غزل دراصل پہلی آواز کی ترجمانی ہے۔ اس لیے دوسری اور تیسری آوازوں کی پوری پوری نمائندگی نہیں کرسکتی۔ غالب اور اقبال کا بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے حدیثِ دلبری کو صحیفۂ کائنات بھی بنا دیا، مگر یہ صحیفہ مغل تصویروں کی طرح کا ہے۔ یہ اشاروں کا صحیفہ ہے اور ہم اسی پہ تکیہ کیے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ نظم کی زبان، غزل کی زبان سے اس لیے مختلف ہونی چاہیے کہ نظم کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں نثر کی تعمیری صلاحیت سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ اس میں اشارے کے بجائے صراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی میں شاعر کی دوسری اور تیسری آوازوں کی بھی گنجائش ہے اور پہلی آواز بھی اس طرح سنائی دے سکتی ہے کہ مختلف آوازیں مل کر ایک سنگیت بن جائیں، جو مسرت اور بصیرت کا خزانہ ہو۔

ولیمیٹ ہی نے ایک اور جگہ کہا ہے کہ جب شاعر میں طباعی ہوتی ہے وہ براہِ راست زندگی کی طرف جاتا ہے، جو شاعر تقلیدی اور خوشہ چیں قسم کا ہوتا ہے وہ ادب کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس بات کو اس طرح سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلی قسم کا شاعر زندہ زبان استعمال کرتا ہے اور دوسری قسم کا کتابی۔ اردو شاعری کی زبان زیادہ تر کتابی ہے، اور اس کتابی زبان کا بڑا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں میر، سودا، سوز، درد، جرأت، آتش، ذوق، داغ، حسرت، آرزو وغیرہ کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کے باوجود مجموعی طور پر غزل کی زبان جس طرح ناسخ، غالب، اقبال، فانی سے متاثر ہوئی ہے، اس کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

کتابی زبان کو ایک اور مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ورڈس ورتھ نے اٹھارویں صدی کی انگریزی شاعری کی زبان کو مصنوعی کہا۔ اس کے رچاؤ اور پختگی میں زندگی کی کمی پائی۔ نثر اور نظم کے مروجہ امتیاز کو کم کر کے شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانا چاہا۔ خود اپنی نظموں میں اس نے اس کے تجربے بھی کیے، جن میں سے کچھ کامیاب ہیں کچھ ناکام۔ کولرج نے اس کے باغیانہ جوش کی اصلاح کی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ورڈس ورتھ نے دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی، اور اس کے اثر سے انگریزی شاعری کو نیا جذبہ، نئی توانائی، نئی زندگی، نیا لہجہ اور نیا اسلوب ملا۔ اس کی طاقت کا کیا اندازہ ہے؟ ورڈس ورتھ نیچرل ہوتے ہوئے بھی مصنوعی ہے کیونکہ ادبی ہے مگر اس کی کوشش صحت مند ہے اور اس کے بڑے اچھے نتائج نکلے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی حالی سے اس قسم کی کوشش کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے یہاں بھی اس قسم کے اشارے ملتے ہیں۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آنچ نہ آئے نہ باز تو

مقدمۂ شعر و شاعری میں انھوں نے ملٹن کے ایک جملے سے مدد لے کر نظم کا جو معیار اس کے ایک مضمون میں ملتا ہے، سادگی، اصلیت اور جوش، پر زور بھی دیا ہے۔ مگر کیا ہم یہ ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے نقطۂ نظر نے شاعری کی زبان سے متعلق ہمارا تصور یکسر بدل دیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ حالی کا گہرا اثر ہوا ہے مگر مجموعی طور پر نظم کی زبان میں ابھی تک غزل کا رنگ و آہنگ زیادہ ہے اور غزل کی زبان کا اس پر غلبہ مسلّم ہے۔

غزل کی زبان کا اثر ایک اور وجہ سے بھی گہرا ہے۔ اردو کے عام شاعر کا احساس چند بندھے ٹکے موضوعات ہی کا اظہار کرسکتا ہے۔ رومانی عشق، مبہم سی انسان دوستی، رواجی اخلاق، محدود نظریۂ علم، عشق کی عقل پر فوقیت، طبقاتی احساس، شہری مزاج، مخصوص مذہبی رنگ۔ یہاں میں صرف ان معنوں میں گفتگو نہیں کر رہا ہوں جن معنوں میں آزاد نے اردو شاعری کی زبان پر تنقید کی تھی، اور نہ صرف ان معنوں میں جن میں فراق نے اردو میں قدیم ہندستانی عناصر کی کمی کا ماتم کیا ہے، بلکہ میں تہذیبی فضا کے محدود ہونے کی بات کر رہا ہوں، جو جاگیردارانہ ذہن کی زیادہ غماز ہے، جسے سماجی تبدیلیوں کا پورا پورا احساس نہیں ہے اور جو تبدیلی پر ماتم زیادہ کرتا ہے، ان کا خیر مقدم کم، جو ٹھہراؤ کا زیادہ قائل ہے، تغیر کا کم اور جو ماضی کو بھی صرف ماضی قریب ہی تک محدود سمجھتا ہے اور اس سے دور جانے کو تیار نہیں۔

اس لیے میرے نزدیک نظم کی زبان، غزل کی زبان کے رچاؤ، اس کی اشاریت، اس کے تہذیبی میلانات، اس کی سماجی اور اخلاقی قدروں سے بلند ہوسکے تو یہ اچھی بات ہوگی۔ نشتر کی افادیت اور حسن سے انکار نہیں، مگر پھاوڑے کے دور میں، ہاتھ میں صرف نشتر لیے زندگی کے معرکے کو سر نہیں کیا جاسکتا۔ نشتر کی ضرورت بھی رہے گی مگر صرف نشتر پر فخر کرنے سے کام نہیں چلے گا۔

نظم کی زبان کی بنیاد بے شک بول چال کی زبان پر ہونی چاہیے، مگر چونکہ نظم ادب کی ایک شاخ ہے، اس لیے بول چال کی زبان کی بے پروائی اور بدنظمی اس کے نشیب و فراز اور اس کی جنسی معاملات میں بے جھجک بات چیت کو ایک ترتیب یا سلیقے کی چھلنی سے اس طرح گزرنا ہوگا کہ اس کا عام فہم، جاندار اور جذبے سے بھرپور حصہ سب کا سب آجائے، اور اس کی مخصوص اصطلاحیں، ناپختگی، اس کا سوقیانہ پن، اس کی چلتاؤ لکنت نکل جائے۔ یہ چھلنی اتنی باریک نہیں ہونی چاہیے کہ اس میں صرف میدہ ہی چھن سکے، بلکہ اس کے سوراخ اتنے بڑے ضرور ہونے چاہییں کہ ان سے چوکر کا خاصا حصہ بھی آٹے کے ساتھ نکل آئے اور اس طرح غذائیت کا اہتمام ہوسکے۔ اس زبان کو کسی عربی یا سنسکرت کی قواعد سے بھی تمام تر آزاد ہونا پڑے گا۔ آج ہم نثر میں ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ اضافت میں نہیں لاتے، لیکن قدما اس کا چنداں لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ہم فارسی کی وہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں جو صرف ایک محدود طبقہ جانتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری بات عام اردو داں نہیں سمجھ سکتا جس کا فارسی کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ غالب اور اقبال کی عظمت کا اعتراف اور احترام کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ آئندہ کے غالب و اقبال اس زبان کو جس شان سے استعمال کرنے پر قادر بھی ہوئے، تو ان کی بات بہت کم لوگ سمجھ سکیں گے۔ انھیں اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے بول چال کی زبان کو بنیاد بنانا پڑے گا اور اس سلسلے میں وہ قدما کی روش اختیار کریں گے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔ ان سے پہلے بھی بہت لوگوں نے ماضی قریب کو چھوڑ کر ماضی بعید سے رشتہ جوڑا ہے۔

(باقی آئندہ)

سید فضل المتین

ماہنامہ آگ اجمیر

شہر اجمیر کو صوبۂ راجستھان کا دل کہا گیا ہے، اجمیر اپنے محل وقوع کے لحاظ سے دلکشی اور خوبصورتی کا باعث ہے، اجمیر کی مذہبی، تاریخی، علمی اور ادبی حیثیت مسلّم ہے اور صوبۂ راجستھان میں سیاست وصحافت کے نقطۂ نگاہ سے بھی اجمیر کی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔

اردو کا سب سے پہلا اخبار "جام جہاں نما" کلکتہ سے ۱۸۲۲ء میں شائع ہوا[۱]۔ اس اخبار کے اجرا سے تقریباً ۳۹ برس بعد یعنی ۱۸۶۱ء میں "خیرخواہِ خلق[۲]" نامی ایک اخبار (جو ہفت روزہ تھا) اجمیر سے نکلنا شروع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان سے شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد ۲۳۰ ہو چکی تھی[۳]۔

اجمیر سے بہ یک وقت کئی کئی اخبار شائع ہوئے۔ قدیم اخبارات میں "راجپوتانہ گزٹ[۴]" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اس کے بعد جو اخبارات شائع ہوئے ان میں ہفت روزہ اخبار "آستانہ[۵]" کی خاص اہمیت ہے۔ (یہ اخبار بعد میں ماہنامہ ہو گیا تھا)۔ آج بھی سارے راجستھان میں اجمیر ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں سے ایک ہفت روزہ اخبار "طوفان[۶]" شائع ہوتا ہے۔

اخبارات کے علاوہ اجمیر سے خالص ادبی رسائل بھی شائع ہوئے ماہنامہ "کیف[۸]" سے ادبی دنیا بخوبی واقف ہے اپنے دورِ اشاعت میں اس ماہنامہ کی خاصی اہمیت تھی

۱۹ر مارچ ۱۹۶۶ء کو میں ایک مشاعرہ کی شرکت کے سلسلہ میں بھیلواڑہ (راجستھان) گیا تھا۔ وہاں حیدر علی شاہین[۹] صاحب نے دورانِ گفتگو میں ماہنامہ "آگ" کا ذکر کیا، نام سن چکا تھا، پرچہ نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کہا وہ پرچہ مجھے دکھائیں، مصروفیت کی بنا پر وہ پرچہ نہیں دکھا سکے۔ لیکن ۱۹ر اپریل ۱۹۶۶ء کو جب وہ ایک مشاعرہ کی شرکت کے لیے اجمیر آئے تو از راہِ کرم پرچہ میرے لیے لیتے آئے۔ جس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

ماہنامہ "آگ" دسمبر ۱۹۴۷ء میں احمد رشید روماں کی ادارت میں اجمیر سے نکلا۔ اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکل سکا اور وہی شمارہ میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ شمارہ عام رسالہ سائز کے ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سالانہ چندہ چار روپیہ اور ششماہی ڈیڑھ روپیہ مقرر کیا گیا تھا[۱۰] ایک پرچہ کی قیمت ۶ آنے رکھی گئی تھی۔

پیشِ نظر شمارے کی فہرست مضامین" یہ ہے

---

[۱] "بھارت میں اردو صحافت کی تاریخ و ترقی": ایک مختصر جائزہ" (حصہ دوم) مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۱ء

[۲] "خیرخواہِ خلق" کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "اجمیر کا پہلا اردو اخبار" مطبوعہ "ہماری زبان" ۱۵ر جون ۱۹۶۳ء نیز ملاحظہ ہو میرا مضمون "راجستھان کے قدیم اخبارات" مطبوعہ ماہی "نخلستان" اودے پور۔ اپریل۔ جولائی ۱۹۶۳ء

[۳] "راجپوتانہ گزٹ" کے لیے ملاحظہ ہو میرا مضمون "راجپوتانہ گزٹ" مطبوعہ "ہماری زبان" ۲۲ر ستمبر ۱۹۶۳ء

[۴] اخبار "آستانہ" اور ماہنامہ "آستانہ" کا تعارف عنقریب ہی کرایا جائے گا۔

[۵] "طوفان" کو شائع ہوتے ہوئے قریب قریب ۲۰ سال ہو گئے ہیں۔

[۶] اپریل ۱۹۶۳ء سے راجستھان ساہتیہ اکیڈمی نے سہ ماہی "نخلستان" کا اجرا کیا ہے۔ جس کے تین شمارے نکل چکے ہیں شمارہ ۴ پریس میں ہے اور "خاص نمبر" زیرِ ترتیب ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض میرے اور پروفیسر پریم شنکر صاحب سری واستو کے ذمہ ہیں۔

[۷] ماہنامہ "کیف" کا تعارف بھی عنقریب ہی کرایا جائے گا۔

[۸] حیدر علی شاہین صاحب کی زبانی علم ہوا کہ ماہنامہ "آگ" کے اجرا میں ان کا خاص ہاتھ تھا اور اس کا ثبوت ماہنامہ "آگ" کی "فہرست مضامین" کے آخر میں تحریری اس عبارت سے بھی ملتا ہے "خطوط و مضامین اس پتہ پر ارسال کریں۔ دفتر ایجنسی رسالہ "آگ" ہسپتال روڈ بھیلواڑہ (راجستھان)۔

[۹] ضمیر احمد ان دنوں بسلسلہ ملازمت انگلستان میں مقیم ہیں۔

[۱۰] محمد عمر خاں گورنمنٹ کالج اجمیر میں اردو، فارسی کے پروفیسر تھے انتقال فرما چکے ہیں۔

[۱۱] شکور احمد۔ ڈاکٹر شکور احمد ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ نفسیات سے منسلک ہیں۔

آخری صفحہ (۴۸) پر "آگ" کے عنوان سے حسبِ ذیل عبارت تحریر ہے اردو زبان کی بقا و احیا کے لیے عبار احتجاں کے قلب سے شائع کیا گیا ہے۔ "آگ" کی اجرا کا مقصد خصوصی جذب منفعت نہیں بلکہ خدمتِ ادب ہے۔ "آگ" اپنے صوری و معنوی ارتقاء کے پروگرام کو "بتدریج" چلائے گا۔ "آگ" کے دامن میں ان گنت کسانوں، مزدوروں اور مصیبت زدوں کے دل کی آگ ہوگی۔ "آگ" انسانیت کی خدمت و سلامتی کا ضامن ہوگا "آگ" میں واقعات و حقائق کی گرمی ہوگی! "آگ" میں بے چین دلوں کی دھڑکن مخیفوں کی پکار اور کمزوروں کی چیخ سنائی دے گی۔ "آگ" اردو سوز عناصر کی تخریب کے لیے منظرِ عام پر آیا ہے۔ "آگ" اردو نیچر کے لیے دفاعی قوت کا مالک ہوگا! "آگ" "درمیانی ادب" کا حامل ہوگا۔ اور مستقبل کی طرف گامزن! "آگ" ہر ماہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔

لہٰذا

"آگ" کا مطالعہ آپ کے لیے ضروری ہے

لہ مردِ مومن سے :۔ اردو کے مشہور جواں مرگ غزل گو شاعر قابل اجمیری کی یہ نظم ہی در اصل ان کے ترکِ وطن کا موجب بنی، ترکِ وطن سے متعلق بعض ادبی حلقوں میں ان کے تعلق سے جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ تمام تر غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

لہ عرشی اجمیری بفضلِ تعالےٰ بقیدِ حیات ہیں ان کے پہلے عارفت نقشبندی کا مضمون "عرشی اجمیری" سہ ماہی "نخلستان" اردو کے شمارہ (۳) میں دیکھا جا سکتا ہے۔

لہ "درمیانی ادب" خدا جانے کن اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

اور

ادارہ "آگ" ملک کے ادبا، شعرا، دمفکرین سے امید رکھتا ہے کہ وہ آگ کی قلمی خدمت کریں گے

آخر میں یہ عبارت تحریر ہے۔

"سید سلطان اختر پرنٹر پبلشر نے اپنے "معین پریس" میں چھپوا کر شائع کیا"

پیشِ نظر شمارہ کی کتابت و طباعت مناسب ہے اور اس کے لیے کاغذ معمولی استعمال کیا گیا ہے۔ ٹائیٹل کور پر ایک آدمی کو آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں دکھایا گیا ہے۔

پیشِ نظر شمارہ میں "سوز و ساز" کے عنوان سے اداریہ ہے "شہرستان"۔ "اردو زبان ہمیشہ سے ہندی ہے" "مغربی اقتصادیات پر اجمالی نظر"، "انقلاب" اور "فراق کی موجودہ شاعری" مضامین ہیں۔ "مصور کی موت"، "آگ"، "ہچکیوں کی لے پر"، "الہم"، "ناکام تمنا" اور "دولت کے پجاری" افسانے ہیں۔ "دائرلیس" کے عنوان سے قارئین کی جانب سے کیے گئے سوالات کے جوابات ہیں۔ "ادبِ لطیف" کے ذیل میں "عید کا چاند" اور "وہ نگاہ" دو مختصر مضامین ہیں۔ "انکشافِ اسرار"، "مردِ مومن سے" اور "انتظار" کے عنوان سے نظمیں ہیں۔ "جذباتِ خستہ"، "نذرِ ساشاعر"، "صدائے شیدائی"، "جذباتِ شائق"، "غزل"، "فریادِ اسیر"، "تم" اور "نوائے تازۂ آذری" کے عنوانات سے غزلیں ہیں۔ اور ساغر اجمیری و خستہ (جاورہ) کی دو رباعیات شریکِ اشاعت ہیں۔ ان دو رباعیات کو "فہرستِ مضامین" میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

لہ سلطان احمد۔ اجمیر کے قابل قدر نوجوان شاعر، اہل قلم، مرحوم ہفت روزہ اخبار "معین" کے مدیر اور "معین پریس" کے مالک اب روزنامہ "امروز" ملتان (پاکستان) کے حلقۂ ادارت سے منسلک ہیں۔

ندا فاضلی

کچی دیواریں

میری ماں ہر دن اپنے بوڑھے ہاتھوں سے
ادھر اُدھر سے مٹی لاکر
گھر کی کچی دیواروں کے زخموں کو
بھرتی رہتی ہے!
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے!!
بیچاری کتنا ڈرتی ہے
میری ماں کتنی بھولی ہے
برسوں کی سیلی دیواریں
چھوٹے موٹے پیوندوں سے
آخر کب تک رک پائیں گے؟
جب کوئی بادل گرجے گا
ہر ہر کرتی ڈھ جائیں گی!!!

جتندر کوشل

پریم امر ہے

(ہندی کی جدید شاعری سے متاثر ہوکر)

ایک نیلا خط
جس کے سینے پر لال، پیلے، نیلے، کالے جانے کتنے ہی رنگوں میں
درد بھری غلوں کے گیت گڈمڈ تھے۔
وہ جیسے ہونٹوں سے پھسل رہا تھا
لپ اسٹک کی لالی میں سنا ہوا رانجھے ہیر کا قصہ
کیا میں اس صدی کا وارث شاہ ہوں
ایک کھنکتا قہقہہ مرد کا ہے یا عورت کا میری بھوک جگا جاتا ہے
چاٹ کی دوکان پر
پھیکے پیار میں نمک، مرچ، چٹنی ڈالی جاتی ہے
پیار امر ہے
ان کھنڈروں میں لگتا ہے پچھلی کہانیوں کے
سبھی عاشق و معشوق پھر سے آگ آئے ہیں
دیکھ رہا ہوں تیلے کاغذ، سوکھے ہونٹ، چائے کی پیالی
میری بھوک چمک اٹھتی ہے
کھنکتا قہقہہ دب جاتا ہے
ایک جھروکے سے کبوتر اڑتا چلا گیا
دوسرے میں اک سایہ لہرایا
نیچے جانے رومیوں کی لائین لگی ہے
میں ایک ایک چہرہ پڑھتا ہوں
ان میں کہیں شیکسپیر تو چھپا نہیں؟

قادری صاحب کی دوسری برسی

پروفیسر آل احمد سرور

قادری صاحب کے نام سے میں آگرے پہنچنے سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ بچپن میں ان کا رسالہ "سعید" بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور اس کی بہت سی نظمیں یاد تھیں۔ جب ۱۹۲۸ء میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرسٹ ایر سائنس میں داخل ہوا تو قادری صاحب سے اور ان کے بڑے بھائی فریدی صاحب سے ملاقات ہوئی دونوں بڑی شفقت سے پیش آئے۔ قادری صاحب کو سینٹ جانس کالج کے اردو میگزین "مشاق" کے لیے میں نے اپنی غزلیں اور نظمیں دیں۔ اب تک یاد ہے کہ جب پہلی غزل شائع ہوئی تھی تو مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۲ء تک چار سال میں نے آگرے میں گزارے۔ آخری دو سال میں قادری صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی علمیت کے ساتھ ان کی شفقت اور محبت اور ان کی شوخ طبیعت کا نقش سب سے گہرا تھا۔ وہ معمولی معلم ہوتے ہوئے بھی معمولی نہ تھے جب میں نے مضامین لکھنے شروع کیے تو قادری صاحب سے خط و کتابت ہونے لگی۔ انھوں نے بعض بڑے لمبے بڑے شوخ اور بڑے دلچسپ خط مجھے لکھے ہیں۔ شاید کاغذات میں مل جائیں؛ تلاش کر رہا ہوں۔ "نگار" میں جدید شاعری کے رجحانات پر کچھ مضامین نکلے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بڑے دلچسپ خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ بڑے اچھے معلم تھے اور اپنے طلبہ میں اردو شعر و ادب سے عشق پیدا کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے اصرار کیا کہ انجمن ترقی اردو کے ایک جلسے میں شرکت کریں۔ وہ اور فریدی صاحب میری باتیں بڑی توجہ سے سنتے رہے اور آنے کا وعدہ کر لیا۔ مگر جلسے میں دونوں نہ آئے۔ قادری صاحب کو صرف لکھنے پڑھنے سے دلچسپی تھی، جلسوں اور ہنگاموں سے وہ دور رہتے تھے ہاں کالج کی اردو سوسائٹی کے جلسوں میں تو ان کو موجود ہی رہنا پڑتا تھا۔

قادری صاحب کی کتاب "داستان تاریخ اردو" اس طرح لکھی گئی کہ اسٹاف روم میں ایک قسط لکھی اور کاتب کو بھیج دی۔ پھر کلاس روم میں چلے گئے شام کو دوسری قسط لکھی۔ خود کہتے تھے کہ جانے کی کتابیں بھی مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں مگر انھوں نے بڑی لگن اور بڑی محنت سے یہ قابل قدر کام کر دیا۔ انھیں دلی نوک جھونک میں بڑا لطف آتا تھا۔ ذرا موقع ملا اور وہ بحث میں کود پڑے۔ خصوصاً اشعار کی تشریح کے سلسلے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ کلاسیکل ادب پر اتنی گہری نظر رکھتے ہوئے اور قدیم وضع کے اتنے دلدادہ ہوتے ہوئے وہ نئے خیالات کی قدر کرتے تھے اور ان پر غور کرنے کو تیار رہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں تو ان کا جواب نہ تھا۔ کاش قادری صاحب کی غیر مطبوعہ تصانیف کی طباعت کا جلد کوئی انتظام ہو سکے۔ ان کی ایک اچھی سوانح عمری کی بھی ضرورت ہے۔ ان کے سے ادیب اور عالم اور صاحب نظر کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

×—×—×

ابوعلی اعظم گڑھ

ناقابلِ فراموش

قصبہ بھدوہی قالین سازی کا اس دیار میں سب سے بڑا مرکز ہے وہاں اس کے بڑے بڑے کارخانے اور گودام ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں یہ مرزاپور میں تھا، معلوم نہیں اب کس مصلحت سے اس کو مرزاپور سے الگ کرکے بنارس کی قسمت سے وابستہ کردیا گیا ہے، حالانکہ پیشہ، صنعت، کاروبار اور تمام دوسرے ذرائع معاش کی یکسانیت کے لحاظ سے اس کو مرزاپور ہی میں شامل رہنا چاہئے تھا، یہاں کے بنے ہوئے قالین ساری دنیا میں خصوصاً یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں مرزاپور ہی کی نسبت سے مشہور ہیں اس کے ۱۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور قصبہ گیان پور ہے جو ریاستوں کے ٹوٹنے سے پہلے ایک اسٹیٹ تھا، جس میں قصبہ بھدوہی مکمل شامل تھا، اس کا الحاق بھی بنارس سے کردیا گیا ہے۔ وہاں ایک عظیم الشان ڈگری کالج بھی ہے جس میں مختلف فنون کی ایم۔ اے تک تعلیم ہوتی ہے ہر ہر شعبہ اور فیکلٹی کی الگ الگ عمارتیں ہیں بہت سے شاندار اور وسیع سائنس کالج اور کامرس کالج کی عمارتیں ہیں۔ سائنس کالج کے ساتھ اسی وسیع لیباریٹری بھی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، میں مارچ کے آواخر میں جب بنارس اور بھدوہی کے مختصر سفر کے سلسلہ میں وہاں گیا۔ تو سالانہ امتحانات ہو رہے تھے، اس لیے میں ان کالجوں کے اندرونی حصوں کو دیکھ نہ سکا، اسی کے احاطہ میں جو ایکڑوں میں پھیلا ہوا ہے سطح زمین سے کسی قدر بلندی پر کالج کی لائبریری بھی ہے جس میں جانے کے لیے ہر چہار طرف سے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں مجھے وہیں کے ایم کام فائنل کے ایک طالب علم کے ذریعہ اس لائبریری میں جانے اور اس کو تفصیل سے دیکھنے کا موقع ملا، لائبریری کی یہ وسیع و عریض عمارت سطح زمین سے ۸۔۱۰ فٹ کی بلندی پر ایک وسیع ہال اور ہر چہار طرف سے متعدد چھوٹے بڑے کمروں اور کھلی ہوئی چھتوں پر مشتمل ہے جن میں قرینہ سے گوڈریج کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی رکھی ہیں ہال میں دیوار سے لگی ہوئی گوڈریج کی الماریوں کے ساتھ ہر دو طرف مطالعہ کی بڑی بڑی میزیں بھی ہیں، جن پر انگریزی اور ہندی کے تمام وقت اشیوجا رسالے اور اخبارات جو ملک کے مختلف حصوں سے نکلتے اور شائع ہوتے ہیں رکھے ہوئے تھے، اسی ہال کے ایک گوشہ میں اس کا لائبریرین بھی بیٹھتا ہے، جس نے پہنچتے ہی خلاف توقع میرا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا جس سے میں بہت متاثر ہوا، اس نے کہا، کہ یہ میرا فرض ہے، کہ جو اس لائبریری میں آئے تو میں اس کا استقبال کروں اور لائبریری کا گوشہ گوشہ دکھاؤں اس میں میرے اخلاق کو کوئی دخل نہیں ہے میں نے کہا کہ آپ کی لائبریری کی مطالعہ کی ان دونوں بڑی میزوں پر مجھے کوئی اردو رسالہ اور اخبار نظر نہیں آرہا ہے اس کے لیے کوئی دوسری میز تو مخصوص نہیں ہے اس نے کہا کہ میں اردو کا اسکالر رہ چکا ہوں اردو میری زبان ہے اور اس سے مجھ کو دلچسپی ہے، لیکن افسوس کہ اس لائبریری میں کوئی اردو اخبار یا رسالہ نہ از خود آتا ہے، نہ منگوانے کی کوئی کوشش کی جاتی ہے، ہر ہر فن کی اور پھر ہندی و انگریزی کی کتابیں الگ الگ کمروں میں الماریوں میں رکھی ہوئی ہیں جن کو لائبریرین نے ایک ایک کرکے مجھے نہایت مستعدی سرگرمی اور دلچسپی کے ساتھ دکھایا میں اس کتب خانہ میں انگریزی اور خصوصاً ہندی زبان کا اتنا بڑا خزانہ دیکھ کر بیحد متاثر ہوا، میں نے کہا، کہ اب مہربانی کرکے مجھے وہ کمرہ بھی دکھائیے جس میں اس ملک میں سب سے زیادہ بولی جانے والی اردو زبان کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں اس نے آہ سرد کھینچ کر کہا کہ اس لائبریری میں اردو کا کوئی شعبہ نہیں ہے اور نہ سوائے ایک کتاب کے جس کو میں ابھی دکھلاؤں گا کوئی اردو کی کتاب موجود ہے میں نے سمجھا کہ وہ اردو کی کوئی نایاب قلمی کتاب کسی اچھے کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوگی۔ جس کو یہ ہمارے فاضل اور اردو دوست لائبریرین صاحب اس ذوق و شوق کے ساتھ دکھانا چاہتے ہیں، یہ کتاب کتب خانہ کی حوالہ کی کتابوں کی ایک الماری میں نہایت حفاظت کے ساتھ مقفل رکھی ہوئی تھی، لائبریرین صاحب الماری سے کتاب نکال کر میرے پاس لائے، تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی، کہ وہ کوئی اردو کی نادر اور کمیاب قلمی کتاب نہیں، جیسا کہ میں گمان کیے ہوئے تھا، دیوان سنگھ مفتون اردو کے مشہور صحافی اور جرنلسٹ کی "ناقابلِ فراموش" ہے جس کی زیارت اور مطالعہ کا مجھے مدت سے اشتیاق تھا، یہ کتاب پاکستان و ہندوستان کی حالیہ جنگ سے پہلے لاہور کے مشہور ہفتہ دار مصور اخبار چٹان میں باقساط شائع ہو رہی تھی جس کی بعض دلچسپ قسطیں میری نظر سے بھی گزر چکی تھیں، اس لیے اس کے دیکھنے کا میں اور زیادہ دلدادہ تھا، اس کو وہاں اصل شکل میں دیکھ کر مجھے جو غیر معمولی مسرت ہوئی اس کا اظہار میں لفظوں میں نہیں کرسکتا۔ وہ بڑی تقطیع پر اتنی عمدہ اور پاکیزہ چھپی ہوئی ہے کہ اس کو دیکھ کر آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ "ناقابلِ فراموش" جو محض دیوان سنگھ مفتون کی ڈائری یا روزنامچہ ہے جس میں انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف طبقات اور افراد سے متعلق جن سے ان کا اب تک کی زندگی میں سابقہ پڑ چکا ہے، اپنے نقوش و تاثرات و تجربات پیش کیے ہیں، اتنے اہتمام سے چھپی ہوگی، غریب لائبریرین نے جو بار بار اردو سے اپنے غیر معمولی شغف اور شوق کا اظہار کرتا جاتا تھا، کہا کہ یہ کتاب بھی اس لیے موجود ہے

واصلاحات

"م" کے استفسار پر!

۱۵ر مئی ۱۹۶۶ء کے "ہماری زبان" میں "مندرجہ ذیل اشعار اور مصرعے کن شعرا کے ہیں" کے زیرعنوان، کچھ اشعار اور مصرعوں کے سلسلے میں جناب "م" کا ایک استفسار چھپا ہے۔

ایک مصرعے کے مصنف کا نام اور حوالہ درج ذیل ہے۔

کہ اک نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں

یہ مصرعہ امیر مینائی کی اس غزل کا ہے جس کا مقطع ہے۔

جو لڑکھڑا کے گرے تو قدم سیاقی کے   امیر مست نہیں ہشیار ہم بھی ہیں

پورا شعر اس طرح ہے۔

کہاں تک آئینے میں دیکھو جمال ادھر دیکھو   کہ اک نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں

(سید منظور الحسن برکاتی۔ ٹونک)

ایک استفسار کا جواب

مورخہ یکم رمئی ۱۹۶۶ء کے "ہماری زبان" کے صفحہ ۸ پر جناب حکم چند نیر کے دو استفسار نظر سے گزرے۔

ایک شاہنامہ فردوسی کے الحاقی شعر کے متعلق، اور دوسرا فارسی کے جملہ "پاسخے بصیرت افروز نیافتم" کے بارے میں،

استفسار اول کے سلسلہ میں فی الحال اتنا عرض کرنا ہے۔ کہ حکم چند صاحب سے مذکورہ شعر کے دوسرے مصرعہ کے نقل کرنے میں سہو ہو گیا ہے۔

شعر مذکور پروفیسر محمود شیرانی مرحوم نے اس طرح تحریر کیا ہے۔

کف شاہ محمود عالی تبار
نہ اندر نہ آمد سہ اندر چہار

مطلب یہ کہ "نہ اندر سہ" کے بجائے "نہ اندر نہ" ہے۔

ملاحظہ ہو۔ فردوسی پر چار مقالے مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند صفحہ ۹۶

استفسار ۲ کے سلسلہ میں عرض ہے۔ کہ "پاسخے بصیرت افروز نیافتم" اور "پاسخ بصیرت افروز نیافتم" دونوں جملے صحیح ہیں۔ البتہ پہلا جملہ زیادہ بلیغ ہے۔

"پاسخے" میں یائے وحدت، یا، یائے تنکیر پڑھی جائے جیسے "شاہے" "گدائے" وغیرہ

اس صورت میں مطلب ہو گا۔ کہ "میں نے سوالات، یا خط کا ایک جواب، یا کوئی جواب، معلومات افزا و بصیرت افروز نہیں پایا۔" سکندر نامہ بری میں مولانا نظامی رح نے "پاسخ" کو "یائے تنکیر" کے ساتھ متعدد جگہ استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

نہ ہر جائے خود پاسخے ساز کرد   در کین پوشیدہ را باز کرد

اور اگر بغیر یائے وحدت و تنکیر، اضافت کے ساتھ "پاسخ بصیرت افروز" پڑھا جائے تو مطلب ہو گا۔ کہ جواب بصیرت افروز نہیں پایا۔" شاہنامہ میں ایک جگہ فردوسی لکھتا ہے ؎

چنیں داد پاسخ کہ رستم نیم
ہم از تخمۂ سام نیرم نیم

بہرحال میری ناقص رائے میں دونوں جملے اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

ع۲ اسی شمارہ اسی صفحہ پر کالم ۲ میں "لفظ رہائش" کے سلسلے میں آغا خلش کاشمیری کا ایک جواب بھی درج ہے۔

موصوف نے اس لفظ کے استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

" فارسی زبان کے مصادر رہانیدن، یا رہاندن سے حاصل مصدر رہائش "بمعنی چھٹکارا، یا، رہائی ہے کسی فارسی زدہ اردو داں نے اردو کے مصدر "رہنا" سے فارسی ترکیب پر "رہائش" حاصل مصدر بنا کر رائج کیا ہے"

جہاں تک اس لفظ کی اختراع و وضع کا تعلق ہے خلش صاحب کا خیال اور قیاس صحیح ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ لفظ سکونت، اور مسکن، کے معنی میں ایک عرصہ سے رائج اور مستعمل ہے۔ اس لیے اب یہ لفظ اردو زبان کا لفظ ہے۔ اور اس کا استعمال جائز ہے۔

اردو کے مشہور ادیب علامہ برجموہن دتاتریہ کیفی تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک لفظ، ایک زبان میں ایک معنی دیتا ہے اور دوسری زبان میں دوسرے۔ جیسے "مور" اردو میں ایک نہایت شاندار بڑے پرند کا نام ہے۔ اور فارسی میں چیونٹی کا۔

کیفیہ صفحہ ۱۰۰

اس کے علاوہ فرہنگ آصفیہ، جو اردو کی مسلم الثبوت اور مستند لغت ہے اس میں مولانا سید احمد دہلوی نے اس لفظ کو ہندی لکھا ہے۔ اور اس کے معنی سکونت، مسکن، قیام، بود و باش، بباست، گھر، ٹھکانا، ماویٰ۔ تحریر فرمائے ہیں۔

لہٰذا اس محکم سند کے بعد اب اس لفظ کے استعمال میں کسی قسم کی پس و پیش کرنا جرأت رندانہ سے کم نہیں۔

(ریاض الحسن)

تکتہ داں کے لیے

"کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کوئی حباب آیا"

جناب غلام حسین صاحب قدر بلگرامی (مؤلف قواعد العروض) نے آتش کے اس شعر کے متعلق لکھا ہے کہ "یہاں محرم کو مضاف ٹھہرا کر، آب رواں، کو مضاف الیہ فارسی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ

محرم لفظ فارسی یا عربی بدیں معنی نہیں۔ فارسی میں "شانک" اور "شانہ کا کچھ" کو کہتے ہیں۔ جب اس میں اضافت نہ ہوگی تو شعر صحیح تقطیع نہ ہوگی۔ بلکہ "مفعولن" ہو کر رکن ساکن رہ جائے گا۔ لہٰذا محرم کا میم دوم یہاں ساکن ہے اور ترکیب ہندی مضاف و مضاف الیہ وزن و تقطیع یہ ہے۔

کسی کی مح۔ مفاعلن۔ رم آ ا یے۔ مفعولن رواکب یا مفاعلن واں فعلن

حباب کے۔ مفاعلن۔ مج برابر۔ فعلاتن۔ کوئی حباب۔ مفاعلن بایا۔ فعلن۔"

اس شعر کے تحت صاحب "قاموس الاغلاط" یہ کہتے ہیں کہ آب رواں بغیر اضافت صحیح ہے

حضرت یاس عظیم آبادی جن کے سامنے۔ قدر بلگرامی کی "قواعد العروض" تھی اس شعر پر حاشیہ لکھتے ہیں کہ "محرم یعنی رازدار اور محرم یعنی آنگیا۔ ان دونوں لفظوں کا قالب ایک ہے اور معنی جدا جدا ہیں مگر دونوں کے معنی میں بھی ایک مناسبت ضرور ہے۔ لہٰذا یہ لفظ ہند بالمعنی ہے اس حالت میں عطف و اضافت صحیح ہے"

غرض قدر بلگرامی۔ محرم کو مضاف ماننے کے لیے تیار نہیں۔ مرزا یاس عظیم آبادی۔ مضاف تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن مولف قاموس الاغلاط جناب ذہین صاحب۔ محرم سے کچھ تعرض نہ کرتے ہوئے۔ آب رواں پر معترض ہیں اور آب رواں۔ صحیح بتلاتے ہیں۔

اگر قدیر صاحب کی بات مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا۔ آتش کے کلام میں ایسے غیر مترنم اور سکتے والے اور اشعار بھی موجود ہیں۔ جنھیں بطور ثبوت پیش کیا جا سکے؟

میری تلاش اور معلومات کا تعلق جہاں تک ہے۔ آتش کے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آتش ترنم اور شعر کو لازم و ملزوم جانتے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ انھوں نے محرم کی میم دوم کو متحرک۔ بااضافت ہی نظم کیا ہے۔

حضرت قدر بلگرامی کا محرم کو مضاف نہ ماننا زبردستی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

مرزا یاس عظیم آبادی نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ۔ محرم ہند بالمعنی ہے۔ لیکن قالب وہی عربی ہے۔ اس لیے اضافت صحیح ہے۔

اردو میں ایسے ہند بالمعنی الفاظ بہت سے رائج ہیں مثلاً جاگیر۔ جاگیردار۔ جاگیردارانہ۔ اور طرفدار وغیرہ جو اپنے اصل معنی سے بہت دور رہیں۔ محرم میں تو ایک معنوی مناسبت ہے بھی۔ لیکن طرفدار اور جاگیردار میں تو یہ بھی مفقود ہے۔

شعر۔ جاگیر جنوں کی قیس کے بعد۔ اب داغ کے نام ہوگئی ہے
(حضرت داغ دہلوی)

جاگیر جنوں جو بعد مجنوں کچھ داغ کے نام ہوگئی ہے
باقی جو ہے جانشین داغ اک کل باغ کے نام ہوگئی ہے
(باغ سنبھلی تلمیذ داغ)

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا۔ (غالب)

حضرت امیر مینائی اس سے بڑھ کر ہم اضافت فرماتے ہیں۔ شعر:

ہوا جب سے وہ گل طرفدار غیر
مرے حق میں کانٹے ہی بس ہوگیا

آخر میں سوال رہ جاتا ہے۔ آب رواں اور آب رواں کا۔ ممکن ہے اردو کے لغت آب رواں ہی صحیح ہو۔ لیکن اگر فصاحت کا استعمال عام کے ساتھ کچھ بھی تعلق ہے تو آب رواں بالاضافت ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

کیا نکتہ داں حضرات اس طرف توجہ فرمائیں گے۔
(تسخیر فہمی)

یہ شعر کس کا ہے؟

دل آپ کا؟ کہ دل میں جو کچھ ہے سب آپ کا؟
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

براہ مہربانی "ہماری زبان" کے توسط سے اطلاع دی جائے۔ اگر شعر غلط ہو تو تصحیح فرمائی جائے۔
(ف۔ اسماعیل)

انجمن ترقی اردو (شاخ نئی دہلی)
کی ایک ادبی نشست

انجمن ترقی اردو شاخ نئی دہلی کی ایک ادبی نشست ۳۱ رمئی ۱۹۶۶ء کو شام میں بیگم انیس قدوائی ایم۔ پی صدر شاخ کی کوٹھی پر منعقد ہوئی۔ شاہ مصباح الدین شکیل کی تحریک پر اردو کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ جناب سجاد ظہیر صاحب نے مہمان خصوصی پروفیسر نبی جان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ انھوں نے مرزا رسوا کی کتاب "امراؤ جان ادا" کا اردو سے براہِ راست ازبکی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ تاشقند یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں اور علی سردار جعفری کی شاعری پر ان دنوں کام کر رہے ہیں۔

پروفیسر نبی جان نے "ازبکستان میں اردو" کے موضوع پر بڑی صاف اور شستہ اردو میں تقریر کی۔ آپ نے بتایا کہ ازبکستان میں اردو زبان سیکھنے کا شوق تیزی سے بڑھ رہا ہے اب تک کوئی تین سو طلبہ اپنی اردو تعلیم ختم کر چکے ہیں۔ ۱۵۰ طلبہ اس وقت زیر تعلیم ہیں۔ ۲۰ طلبہ پوسٹ گریجویٹ تحقیق کا کام کر رہے ہیں، جن شخصیات پر یہ کام ہو رہا ہے ان میں قابل ذکر علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، مجروح سلطان پوری، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین ہیں۔

پروفیسر نبی جان نے یہ بھی بتایا کہ امراؤ جان ادا کا ترجمہ بے حد مقبول ہے اور اب تک اس کے ایک لاکھ ۲۰ ہزار پر مشتمل دو اڈیشن نکل چکے ہیں۔ تاشقند میں ایک اشاعت گھر بھی ہے جس سے اردو کی بہترین کتابوں کے ترجمہ ازبکی زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر تاشقند کے اردو داں غالب کے دیوان کا ترجمہ بطور نذر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال غالب کی ۱۴۰ منتخب غزلوں کا ازبکی زبان میں منظوم ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ وہی بحر، قافیہ اور ردیف ہے۔ ہم اس کارنامہ پر فخر کرتے ہیں۔

پروفیسر موصوف نے یہ بھی بتایا کہ اسی اشاعت گھر سے ترقی پسند شعرا کے کلام کے مجموعے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ تاشقند ریڈیو سے روزانہ دو گھنٹے کا اردو پروگرام نشر ہوتا ہے۔

تقریر کے بعد مختلف سوالات کیے گئے۔ شکیل صاحب نے پروفیسر نبی جان صاحب کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کی کہ جن شعرا اور ادیبوں پر کام ہو رہا ہے وہ ایک خاص مکتب خیال کے نمائندہ ہیں۔ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ اردو کے کلاسیکی ادب سے بھی تاشقند کے اردو داں طبقہ کو روشناس کروایا جائے اب تک سوائے غالب کے اور کسی پر توجہ نہیں کی گئی ہے۔

پروفیسر نبی جان نے کتابوں کے تبادلے سے متعلق اپنی دشواری کا اظہار کیا کہ انھیں اردو کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ حاضرین نے مرکزی انجمن ترقی اردو سے اس معاملہ میں دلچسپی لینے کی درخواست کی۔

صدر جلسہ قاضی عبدالودود نے اہل ازبکستان کی اردو سے دلچسپی پر اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور کہا کہ شاید بیرونی ممالک میں ازبکستان سب سے زیادہ اردو سے حقیقی معنوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔

(مصباح الدین شکیل)

حیدرآباد میں ادبی ٹرسٹ کا قیام

ادارۂ "سیاست" حیدرآباد کے زیر اہتمام ادیبوں، شاعروں کی امداد اور اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے حیدرآباد کی ادبی تاریخ میں پہلی مرتبہ ٹرسٹ کا قیام کے امکانات کی سعی کامیاب ہوئی۔ ایک کل ہند مشاعرہ کے انعقاد سے جو ۸ رمئی کو اعلیٰ پیمانے پر منعقد ہوا تھا عطیوں اور ٹکٹوں کی فروخت سے پندرہ ہزار روپے جمع کیے گئے جن میں مہدی نواز جنگ اور فلمی ہدایت کار سنتوش کے ایک ایک ہزار کے علاوہ حضرت جگر کی واٹر کلر پورٹریٹ کی فروخت سے جسے ممتاز آرٹسٹ سعید بن محمد نے تیار کیا تھا۔ جناب دوست محمد علاء الدین نے (۵۰۱) روپوں میں خریدا۔

کل ہند مقصدی اور یادگار مشاعرہ ریاستی وزیر فنانس ڈاکٹر چنا ریڈی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پدم بھوشن مہدی نواز جنگ نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے ادبی ٹرسٹ کا قیام کے سلسلے میں ادارۂ سیاست اور جناب عابد علی خاں مدیر سیاست کی کوششوں کو سراہا۔ صدر مشاعرہ کمیٹی نواب میر احمد علی خاں وزیر داخلہ نے ٹرسٹ کے قیام اور تعاون کی درخواست کرتے ہوئے مقصدی مشاعرہ کے انعقاد پر روشنی ڈالی۔ مشاعرہ میں امریکی شاعر الشیریک اور مہمان شعرا کیفی اعظمی، جگن ناتھ آزاد، ہیکل اتاہی، مینا قاضی اور کیلاش ماہر کے علاوہ حیدرآباد سے مخدوم محی الدین، حیرت بدایونی، کنول شاہ کنول، انور معظم، شاذ تمکنت، سلیمان اریب، تاج مہجور، حکیم یوسف حسین خاں، ناصر کرنولی اور دیگر شعرا کے دوش بدوش دکنی کے ایک مشہور کرناٹکی شاعر سلیمان خطیب نے کلام سنایا۔ چھ ہزار باذوق اصحاب نے دلجمعی سے مشاعرہ سنا جسے سلیمان اریب صاحب نے کنڈکٹ کیا۔ مشاعرہ کمیٹی کی طرف سے ادبی ٹرسٹ کے قیام کے سلسلے میں ایک عمدہ ساوینیر بھی شائع کیا گیا تھا۔

(و۔ خ)

شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام

آصف علی اردو وظائف اور دو نئے کورس

آصف علی اردو وظائف:۔

(۱) ملک کے با ذوق طلبہ کی مدد کے لیے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے جولائی ۱۹۶۶ء سے چھ وظائف دینے کا انتظام کیا ہے۔

(۲) یہ وظائف آصف علی میموریل ایم۔ اے اردو اسکالر شپ کہلائیں گے اور ان طلبہ کو دیے جائیں گے جو دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایم۔ اے کلاس میں داخلہ لیں گے۔

(۳) ہر وظیفہ مبلغ ۵۰ روپیہ ماہوار کا ہوگا، اور ایم۔ اے سال اوّل سے ایم۔ اے سال دوئم تک ملتا رہے گا۔

(۴) یہ وظائف ایک مقابلہ کے امتحان کی بنیاد پر ان طالب علموں کو دئے جائیں گے جو علی الترتیب اوّل، دوئم سوئم درجہ حاصل کریں گے۔

(۵) مقابلہ کا امتحان دہلی یونیورسٹی میں جون ۱۹۶۶ء کے آخر میں ہوگا۔

امتحان کا فارم اور مزید معلومات رجسٹرار دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مخطوطات شناسی کا سرٹیفکیٹ کورس:۔

شعبہ اردو نے مخطوطات شناسی کا ایک کورس شروع کیا ہے یہ کورس ہندوستان میں پہلی دفعہ شروع کیا جا رہا ہے اور اس کی اہمیت ان حضرات سے پوشیدہ نہ ہوگی جو مخطوطات کی تدوین و ترتیب کے کام میں مصروف ہیں حقیقت یہ ہے کہ بغیر اس علم کو جانے ہوئے قلمی نسخوں پر کام کرنا بہت دشوار ہے اردو میں صدہا مخطوطات ایسے ہیں جن کو ابھی تک سائنٹیفک ڈھنگ سے مرتب نہیں کیا گیا ہے ان کی تہذیب و ترتیب کے بعد ہی ہماری ادبی تاریخ کے گوشے اجاگر ہو سکیں گے۔

اس کورس میں وہ طلبہ داخلہ لے سکیں گے جنھوں نے ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی سے اردو کا ایم۔ اے پاس کیا ہو اور اس میں کم سے کم پچاس فیصدی نمبر حاصل کیے ہوں طلبہ سے اس کی بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ فارسی سے بھی آشنا ہوں گے۔ یہ کورس ایک سال کا ہوگا۔

یہ کورس ان لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوگا جو نیشنل آرکائوز رکارڈ آفس میوزیم اور مخطوطات کی لائبریریوں میں ملازمتوں کے خواہش مند ہیں۔

اردو ایم لٹ کورس:۔

شعبۂ اردو نے دو سال کا ایم لٹ کورس بھی شروع کیا ہے اس میں وہ طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں۔ جنھوں نے اردو کا ایم اے سکنڈ ڈویژن میں کسی بھی منظور شدہ یونیورسٹی سے پاس کیا ہو۔

ایم لٹ کے کورس کے سلسلہ میں تین باتیں اور قابل ذکر ہیں۔

(۱) وہ طلبہ جنھوں نے اردو کا ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے وہ پی۔ ایچ ڈی میں براہ راست داخلہ لے سکتے ہیں ان کے لیے ایم لٹ لازمی نہیں ہے۔

(۲) ایم لٹ کا ہر طالب علم ایک استاد کی نگرانی میں کام کرے گا۔

(۳) اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایم لٹ کے طلبہ کو اسی طرح وظیفے دے سکے جیسے کہ پی ایچ ڈی کے طالب علموں کو دئے جاتے ہیں۔

ان نئے کورسوں کے سلسلے میں مزید تفصیلات صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے حاصل کیجیے۔

خواجہ احمد فاروقی
(پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی)

دہلی کے کالجوں میں داخلوں کی سہولتوں کے لیے اقدام

اراکین انجمن ترقی اردو مغربی دلّی کا اعلان

دلّی ۷ر جون۔ طلبہ کی ہر سال بڑھتی ہوئی تعداد اور کالجوں میں سیٹوں کے محدود ہونے کی وجہ سے داخلوں کے وقت بڑے ناخوش گوار تجربوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ طلبہ کو بیک وقت کئی کالجوں میں تقدیر آزمائی کے لیے پریشان پھرنا پڑتا ہے، طرح طرح کی دقتوں اور مشکلوں سے گزرنا پڑتا ہے، بعض اوقات عجلت میں مضامین کا انتخاب اور ناپسندیدہ نصاب کے لے لینے کی وجہ سے بھی ان کو مستقبل میں الجھنیں پیش آتی ہیں۔ بہت سے طلبہ مختلف ذہنی کشمکش اور غلط قسم کے فیصلوں کا شکار ہو کر یا داخلے اور ضروری مراعات نہ ملنے کی صورت میں اپنا سال ضائع کر دیتے ہیں، یہ خراب صورت حال گزشتہ برسوں سے برابر دیکھنے میں آ رہی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اراکین انجمن ترقی اردو مغربی دلی نے ترویج و اشاعت اردو کے علاوہ دلی کے کالجوں میں داخلوں کی سہولتیں اور مستحق طلبہ کے لیے مراعات اور مضامین کے سلسلے میں مشورہ دینے کے لیے مبارک اقدام کیا ہے۔

اس لیے اب جب کہ دلی ہائر سکنڈری بورڈ کے نتائج نکل چکے ہیں اور کالجوں میں داخلے کا وقت آ گیا ہے، وہ تمام طلبہ و طالبات کہ جن کے پاس اردو ہے یا جو بی۔ اے پاس اور آنرز اردو کے خواہش مند ہیں یا دوسرے مضامین میں دلچسپی رکھتے ہیں اور مراعات کے خواہاں ہیں۔ ان کالجوں میں داخلے کی سہولتیں، زبان کی بقا اور افادیت کے پیش نظر مضامین کے انتخاب اور مراعات کے حصول کے لیے مندرجہ ذیل حضرات سے کسی بھی روز صبح سات بجے سے ۹ بجے تک رجوع کرنا چاہیے تاکہ صحیح و نیک مشورے کے تحت ان کا مستقبل روشن ہو سکے۔

(۱) کاش دہلوی ایم۔ اے قصاب پورہ صدر بازار دلی۔

(۲) شمیم احمد اعافہ کالے صاحب بلیماران دلی۔

(۳) انیس عمر احویلی حسام الدین حیدر طیاران دلی۔
(۴) محمد رضا، رضا ٹیلرز جامع مسجد دلی۔
(۵) سراج الدین قریشی گلی گڑھیا والی، قصاب پورہ صدر بازار دلی۔

(جنرل سکریٹری ہذا شاخ مغربی دلی)

پٹیالہ میں روسی ادیب کا خیر مقدم

پٹیالہ ۳۱؍مئی ۶۶ء۔ گزشتہ شب میونسپل کمیٹی پٹیالہ کے ٹاؤن ہال میں انجمن ترقی اردو (ہند) ماڈل ٹاؤن پٹیالہ اور انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی پٹیالہ کے اشتراک سے روس کے تاریخی شہر تاشقند سے آئے ہوئے اردو زبان کے اسکالر روسی ادیب و شاعر جناب نبی محمدوف کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت پنجاب اسمبلی کے اسپیکر عزت مآب جناب ہربنس لال صاحب نے فرمائی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ماڈل ٹاؤن پٹیالہ کے نائب صدر جناب نوبہار صابر نے معزز مہمان اور اسپیکر پنجاب اسمبلی جناب ہربنس لال کی گلپوشی کی۔ اس کے بعد صابر صاحب اور انڈو سوویٹ کلچرل سوسائٹی پٹیالہ کے روح رواں ڈاکٹر ست شنڈن نے اپنی خیر مقدمی تقاریر میں انڈو سوویٹ دوستی کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں انجمن کے صدر پروفیسر کرپال سنگھ بیدار نے میر مشاعرہ کے فرائض انجام دیتے ہوئے مشاعرہ کی کارروائی شروع کرائی۔ پہلے دور میں تاشقند سے متعلق نظمیں پڑھی گئیں جس کا افتتاح انجمن ہذا کے سکریٹری جناب جوہر بھارتی کی نظم "طوفان کے بعد" سے ہوا۔ تاشقند کے موضوع پر کئی شعراء نے نظمیں پڑھیں۔ آخر میں جناب نبی محمدوف نے غالب کی ایک غزل ترنم سے سنائی۔

جناب ہربنس لال اسپیکر پنجاب اسمبلی کی صدارتی تقریر کے بعد یہ محفل انتہائی خوشگوار ماحول میں اختتام کو پہنچی۔

(جوہر بھارتی سکریٹری)

انجمن ترقی اردو انبالہ چھاؤنی کی تعزیتی میٹنگ

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ انبالہ چھاؤنی کے زیر اہتمام صدر انجمن جناب صابر ابوہری صاحب کی قیام گاہ پر پرسوں شام ایک نشست خاص منعقد ہوئی جس میں متفقہ طور پر مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ انبالہ چھاؤنی کی یہ نشست اردو کے مشہور قوم پرست شاعر جناب سورج کنول سرورکی بے وقت اور ناگہانی موت پر انتہائی افسوس اور ان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتی ہے

یہ انجمن حکومت پنجاب سے پرزور اپیل کرتی ہے کہ مرحوم کی ادبی اور قومی خدمات کے پیش نظر ان کے کمسن بچوں کی گزر اوقات کے لیے کم از کم ۱۵۰ روپیہ ماہانہ پنشن مقرر کرے۔

(سکریٹری)

جوہر ٹونکی کا انتقال پر ملال

ٹونک کے ادبی اور شعری حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی گئی کہ یہاں کے مشہور نظم گو شاعر جناب صاحبزادہ محمد مصطفیٰ خاں صاحب جوہر ۲؍جون کو کوٹہ سے ۱۸ میل دور ایک گاؤں میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔

اس جانکاہ خبر پر تمام ادبی حلقوں میں اس پر اظہار رنج و الم کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو ٹونک کے ارکان نے اس ادبی سانحہ پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اور جوہر صاحب کی وفات کو ٹونک کے شعر و ادب کے لیے ایک نقصان عظیم قرار دیا ہے۔ جوہر صاحب ٹونک کے ایک خوش فکر اور پر گو نظم نگار شاعر تھے۔ ہندوستان کے متعدد اخبارات و رسائل میں اکثر آپ کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ آپ نے بعمر ۵۴ سال انتقال کیا۔ اس عرصہ میں آپ کا ایک دیوان "رزم بزم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نایاب و نادر کتب جمع کرنے کا آپ کو بہت شوق تھا جس کی وجہ سے قیمتی اور نادر کتب کا اچھا ذخیرہ آپ نے جمع کر لیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے ٹونک کے ادبا و شعرا کی جانب سے ہم ان کی خدمت میں خصوصاً ان کی والدہ صاحبہ اور چھوٹے بھائی عباد اللہ صاحبزادہ کی خدمت میں تعزیت پیش کرتے ہیں۔

(منظور الحسن برکاتی سکریٹری انجمن)

جناب محروم کی وفات پر سکریٹری راولپنڈی رائٹرز گلڈ کا بیان

راولپنڈی ۲۷؍مئی ۱۹۶۶ء۔ اخبارات میں اردو کے بزرگ اور نامور شاعر جناب تلوک چند محروم کے انتقال کی مختصر خبر شائع ہوئی ہے اس سانحہ کی اطلاع پا کر راولپنڈی کے شاعروں اور ادیبوں کو انتہائی صدمہ ہوا ہے۔ جناب تلوک چند محروم کا راولپنڈی سے خاص تعلق رہا ہے آزادی ملک سے قبل انھوں نے سالہا سال تک اس علاقے میں رہائش پذیر رہ کر اردو زبان و ادب کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں وہ کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

ان کی شاعری انسان دوستی اخوت باہمی اتحاد و اتفاق اور آشتی کے مضامین سے پر ہے۔

ان کی خدمات کے پیش نظر پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی اکتوبر میں ایک بہت بڑے پیمانے پر "یوم محروم" منانے کا ارادہ کر رکھا تھا خیال تھا اس موقع پر اردو زبان کے اس محسن کو اپنے ہاں مدعو کر کے ان کی خدمات میں خراج تحسین و عقیدت پیش کیا جاتا لیکن افسوس کہ پاک بھارت جنگ چھڑ جانے سے تمام پروگرام درہم برہم ہو گیا اور ہماری تمنا پوری نہ ہو سکی۔ جناب محروم کی وفات سے برعظیم پاک و ہند ایک عظیم محب انسانیت ایک جلیل القدر شاعر اور ایک بلند شخصیت سے محروم ہو گیا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ ان کی اچانک رخصت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا۔

ایوب محسن
(سکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی)

تالی کوٹ میں اردو مدرسہ کا افتتاح

یکم رجون ۱۹۶۶ء تالی کوٹ (ضلع بیجاپور۔ ریاست میسور) میں انجمن ہائی اسکول کے نام سے اردو مدرسہ کا افتتاح ہونے کی خبر اردو داں طبقے کو دیتے ہوئے یہ خوشی محسوس کی جاتی ہے۔ تالی کوٹ ایک تاریخی حیثیت سے جنوبی ہند کا پانی پت کہلاتا ہے۔ یہ ایک عرصہ تک مغلیہ خاندان کے قلمرو میں رہا۔ مغلیہ دور میں اردو کی ترویج و اشاعت جس طرح سے ہوئی اس کی مثال ہندوستان میں بہت کم ملتی ہے۔ اس سرزمین پیدا ملا نصرتی اور ہاشمی جیسے اردو شعراء پیدا ہو کر نورسپور میں گلشن اردو کی آبیاری کی تھی۔ گردش زمانہ نے کئی صدیوں تک اس گلشن کو اجاڑ و ویران بنا رکھا تھا۔ مگر پچیس سال قبل اردو ہمدردان کا ایک طبقہ اردو کی بقا و ترویج کے لیے متحد ہو کر بیجاپور میں ایک اردو ہائی اسکول کا افتتاح کر کے اردو کے ترقی کے لیے مشعل راہ کا کام کیا۔ اس مختصر عرصہ میں انجمن اسلام بیجاپور اپنے زیر نگرانی ضلع بھر میں کئی ابتدائی اور کئی وسطانوی مدارس قائم کرنے کا ایک سلسلہ جاری رکھا۔ جو دیکھتے دیکھتے ہی ضلع بھر میں اردو مدارس کی تعداد سیکڑوں تک ہو گئی۔ جیسے ہی طلبہ کی تعداد اور اردو زبان سے انسیت رکھنے والوں کی تعداد سیکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک ہو گئی۔ تو ثانوی مدارس کا افتتاح ہونا شروع ہو گیا جس کے نتیجہ میں اب ضلع بھر میں آٹھ اردو ہائی اسکول جاری ہو چکے ہیں۔ یہ اردو داں طبقہ کے لیے روشن مستقبل کے تعمیر میں بیش بہا اقدام ہے۔ تالی کوٹ کے اردو داں طبقہ کی دیرینہ تمناؤں کا خواب آج شرمندہ تعبیر ہوا۔ صرف بیس روز کے قلیل ترین عرصہ میں شہر کے نوجوانوں نے ایک انجمن بنائی۔ اسکی زیر نگرانی ایک اردو ہائی اسکول جاری کرنے کا اعلان کیا۔ اور حکومت میسور سے منظوری بھی حاصل کر لی۔ اور یکم رجون کو اس کا افتتاح شاندار طریقہ پر سرکاری اور غیر سرکاری ہزاروں لوگوں کو اجتماع میں ایک جلسہ منعقد کر کے افتتاحی رسم ادا کی گئی۔

(ایس۔ اے۔ مکنپار۔ مدرس۔ اردو مڈل اسکول تالی کوٹ)

صفحہ ۶ سے آگے

کہ مرکزی گورنمنٹ دہلی نے خاص طور سے اس لائبریری کے لیے بھیجا ہے اور حفاظت کے خیال سے ریفرنس کتابوں کے ساتھ رکھ دی گئی ہے جو اس لائبریری میں آئے گا اور اردو کا شوق کرے گا، تو یہ کتاب دکھا دی جائے گی۔

کیا گیان پور کے اس شاندار اور ترقی پذیر ڈگری کالج کے لائق منتظمین جو یقیناً بنارس اور اس کے قرب و جوار ہی کے رہنے والے ہوں گے۔ اپنے کالج کی لائبریری میں اردو کا جو ہندوستان کی زندہ ترین زبان اور بعض صوبوں یعنی کشمیر، پنجاب، دہلی، راجستھان، یوپی، بہار، اور آندھرا پردیش کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے سکشن قائم کرنے کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ انگریزی اور ہندی کے ساتھ اس لائبریری میں اردو کتابوں کا نہ ہونا اتنی بڑی بدقسمتی ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ کالج اردو کے علاقہ میں نہیں، کسی ایسے جزیرہ میں ہے، جہاں اب تک اردو کا گزر نہیں ہوا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ اس دور میں اس طرح کے کتنے ڈگری اور ان ڈگری کالجوں میں اردو کی تعلیم تو الگ رہی، ان کی لائبریریاں اردو کتابوں سے خالی ہوں گی۔ طرفہ یہ ہے کہ یہ ڈگری کالج بنارس یونیورسٹی سے نہیں، جس کے متعلق عام طور سے یہ بدگمانی ہے کہ اس کو دنیا کی اور متمدن اور ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں اردو کی تعلیم و ترقی سے چنداں دلچسپی نہیں ہے، اور جہاں سے آج تک اردو کا کوئی اچھا اسکالر نہیں پیدا ہوا ہے، آگرہ یونیورسٹی سے ملحق ہے جس سے ملحق کالجوں میں عام طور سے اردو کی تعلیم کا انتظام اور ان کی لائبریریوں میں اور زبانوں کے ساتھ اردو کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ نظر آتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ جب کبھی میری طرح اردو زبان و ادب کے کسی شائق کو اس لائبریری کے دیکھنے کا اتفاق ہو تو اس کو اردو کتابوں کی زیارت اور مطالعہ سے محروم نہ ہونا پڑے گا، اور اس وقت تک اردو کی کلاسیکل کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اکٹھا کر لیا جائے گا، جو اس لائبریری کے لیے بڑے شرف اور عزت کی بات ہوگی۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا پبلشر نذر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کی